# سیرت النبی ﷺ کی تفہیمِ جدید
## (ایک تحقیقی مطالعہ)

سید مظفر حسین [1]

smrizvi_12@hotmail.com

**کلیدی کلمات:** سیرت کی جدید تفہیم، معترضین سیرت، حضرت عیسیٰؑ، سابقہ انبیاء

**خلاصہ**

سیرت کے مختلف پہلوؤں پر کافی بحثیں کی گئی ہیں لیکن بنیادی سوال یہ ہے کہ سیرت طیبہ کی نئی روش اور تفہیم کا اظہار کیونکر ممکن ہے۔ جبکہ یہ دعویٰ بھی ہے کہ قرآن اور سیرتِ پیغمبرؐ ہر زمانے کے انسان کے لئے نجات بخش ہیں۔ البتہ معترضین کی طرف سے یہ اشکال اپنی جگہ باقی ہے کہ چودہ سو سال قبل وضع کئے گئے اصول اور قوانین آج کس طرح لائق تقلید ہو سکتے ہیں؟ مسلم دانشوروں کی متفقہ رائے ہے کہ آپؐ کی سیرت ہر زمانے اور ہر تقاضے کے مطابق ہے۔ اس عقیدے کی یقیناً یہ توجیہہ ہو سکتی ہے کہ مسلمان آپؐ کی مکمل پیروی کرتے ہیں اور آپ کو اللہ کا آخری نبی مانتے ہیں۔ لیکن جب ہم دیگر مذاہب کے پیروکاروں کے شبہات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں کئی طرح کے سوالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ سب سے بڑا اعتراض یہ کہ پیغمبر اسلامؐ کی شخصیت، سیرت اور اقوال ایک خاص مدت کے لئے قابلِ عمل تو ہو سکتے ہیں تاہم اُن کی سیرت کو ہر زمانے کے لئے باعثِ تقلید قرار دینا روایت پسندی کا مظاہرہ ہی ہوگا، جدت پسندی اور روشن دماغی کی علامت نہ ہو گی۔ مسلمان مفکرین دعویٰ کرتے ہیں کہ اس اشکال کو ردّ کرنے کے ٹھوس شواہد موجود ہیں۔ اس مقالے میں انہی سوالات کا جواب تلاش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرت کی نئی روش اور تفہیم کا اظہار کیونکر ممکن ہو۔ یہ سوال اس مقالہ میں بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ مورخین اور سیرت نگاروں نے اگرچہ سیرت کے ہرہ پہلو کو زیر بحث لایا ہے اور آج کے انسان کے لئے زندگی گزارنے کے کئی بنیادی اصول کی نشاندہی بھی کی ہے ۔لیکن یہ سوال اپنی جگہ قائم رہے گا کہ سیرت طیبہ کے حوالے سے تحریری مواد اس قدر دستیاب ہونے کے باوجود ایک نئی تحقیق کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ دوسری جانب مسلمان دانشوروں کا یہ دعویٰ بھی ہمارے پیش نظر ہے کہ قرآن اور سیرتِ پیغمبر اسلام ﷺ ہر زمانے کے انسان کے لئے نجات کے باعث ہیں۔

گویا دونوں کی عملی تعبیر ہر زمانے کے مطابق ہوتی رہے گی۔ البتہ معترضین کی طرف سے پیدا کردہ یہ اشکال کہ چودہ سو سال قبل وضع کئے گئے اصول و قواعد اور قوانین آج کے زمانے کے لئے کیونکر لائق تقلید ہو سکتے ہیں؟ یا صدیوں قبل کے ایک مصلح کے افکار و نظریات کو عصری تناظر میں پیروی اور تقلیدی کے لئے قابلِ عمل جاننا درست اقدام ہے؟ اپنی جگہ برقرار رہے گا۔ مسلم دانشوروں کی متفقہ رائے ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ ﷺ اور آپ کی سیرت ہر زمانے اور ہر تقاضے کے مطابق ڈھلنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہے۔ اس امر اعتقادی کے پس پردہ یقیناً یہ توجیہہ ہو سکتی ہے کہ مسلمان پیغمبر اسلام ﷺ کی مکمل پیروی کرتے ہیں اور آپ کو اللہ کے آخری نبی کے طور پر مانتے ہیں۔

لیکن جب ہم دیگر مذاہب کے پیروکاروں کے اشکالات اور شبہات پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں کئی طرح کے سوالات اعتراض کی صورت میں نظر آتے ہیں۔ سب سے بڑا اور عام اعتراض یہی ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی شخصیت، سیرت اور اقوال ایک خاص مدت کے لئے قابلِ عمل تو ہو سکتے ہیں تاہم اُن کی سیرت کو ہر زمانے کے لئے باعثِ تقلید قرار دینا روایت پسندی کا مظاہرہ ہی ہوگا، جدت پسندی اور روشن دماغی کی

---

[1] ۔ریسرچ اسکالر، شعبہ علوم اسلامی، جامعہ کراچی

علامت نہ ہو گی۔ یہ مخالفین اور معترضین کا سب سے بڑا اشکال ہے۔ مسلمان مفکرین دعویٰ کرتے ہیں کہ اس اشکال کو رد کرنے کے ٹھوس شواہد موجود ہیں اور یہ شواہد مندرجہ ذیل دلائل کی صورت میں بیان کئے جاسکتے ہیں:

## پہلی دلیل

حضرت عیسیٰ ؑ کا زمانہ پیغمبر اسلام ﷺ سے پانچ سو سال قبل کا ہے اور دنیا کی ایک کثیر آبادی آج بھی اُن کی تعلیمات کو اپنے لئے نجات کا باعث سمجھتی ہے۔ جب ما سبق انبیاء علیہم السلام کی تعلیمات ہر زمانے کے لئے قابلِ قبول ہو سکتی ہیں تو پھر پیغمبر اسلام ﷺ کے فرامین جدید دنیا کے لئے لائق عمل کیوں نہیں ہو سکتے۔ حضرت عیسیٰ ؑ کا زمانہ موجودہ زمانہ سے کافی بُعد میں ہونے کے باوجود اُن کی تعلیمات وقت اور حالات کے تقاضوں کی بھرپور تشریح کر سکتی ہیں تو پھر بطریق اولیٰ پیغمبر اسلام ﷺ کی تعلیمات زیادہ بہتر انداز میں زمانے کی تشریح و توضیح کر سکتی ہیں۔

## دوسری دلیل

جس طرح دیگر انبیاء و مرسلین تبلیغی فرائض اور اخلاقی تعلیمات کی ترسیل و ترویج میں باہمی تفاوت رکھنے کے باوجود ایک ہی ہدف کے داعی تھے بالکل اسی طرح پیغمبر اسلام ﷺ کی تمام تر تعلیمات اور سیرت بھی ایک ہی مقصد کے ارد گرد گھومتی تھی اور وہ مقصد خدائے واحد کی شناخت اور انسانیت کی نجات کا تھا۔ لہٰذا اللہ کے نمائندگان کی تعلیمات اُن کے اپنے زمانے میں نافذ العمل ہونے کے ساتھ ساتھ آج بھی دُنیا کی کثیر آبادی میں قابل قبول سمجھی جاتی ہیں، پیغمبر اسلام ﷺ نے تو خود کو جدید مصلح کے طور پر متعارف کرایا اور اُن تمام اخلاقی اور معاشرتی خصلتوں کو جن کا تعلق انسان کی فلاح و بہبود سے تھا، نہ صرف قابل عمل جانا، بلکہ ان کو کارآمد بنانے میں بھی کلیدی کردار ادا کیا۔

جہاں دیگر انبیاء دین، مذہب، تعلیم اور اخلاق کے اعتبار سے باہمی تفاوت رکھتے ہیں اور اُن کی تعلیمات ہر زمانے کے لئے نافذ العمل ہیں، بالکل اُسی طرح پیغمبر اسلام ﷺ کی تعلیمات بھی زیادہ روشن ہیں اور ہر زمانے کے لئے رہنمائی فراہم کر سکتی ہیں۔ مسلمانوں کا دعویٰ ہے کہ اسلام آخری دین اور پیغمبر اسلام ﷺ آخری نبی ہیں۔ قیامت تک یہی دین رہے گا اور اسی پیغمبر کی تعلیمات نافذ العمل رہیں گی۔

اس عقیدے کے اثبات کے لئے ضروری ہے کہ اسلام بھی ہر زمانے کے حالات کے مطابق ڈھلنے کی صلاحیت رکھتا ہو اور مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق پیغمبر اسلام ﷺ کی شخصیت بھی بدلتے حالات کے ساتھ ہر نئے اُفق پر رہنمائی فراہم کرنے کی پوری قوت رکھتی ہے۔ آپ کی تعلیمات، اقوال، افعال اور زندگی کے طور طریقے نہ صرف ماضی کی روایات کے امین رہے ہوں بلکہ مستقبل کے لئے خوشنما اسلوب وضع کرنے کے بھی ضامن بن سکتے ہوں۔

## تیسری دلیل

الٰہی نمائندگان کی تمام تر مساعی انسان کی ذہنی و اخلاقی تربیت ہے۔ لہٰذا پیغمبر اسلام ﷺ کی طرف سے انسانی اذہان و ارواح کی تطہیر کا دعویٰ اگرچہ بعض لوگوں کے لئے ناقابل قبول ہو سکتا ہے، لیکن بطور عمومی آپ کی تمام تر تعلیمات بھی انسانی اقدار، اخلاقیات اور ذہنی تربیت کے ارد گرد گھومتی ہیں۔ اس لئے یہ کہہ کر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی تعلیمات فرسودہ روایات کی امین ہیں اور جدید زمانے کی مشکلات اور مسائل کے حل کی طرف رہنمائی نہیں کر سکتیں۔

یہاں تک بحث اُن موارد کے حوالے سے تھی جو عام طور پر معترضین کی طرف سے اُٹھائے جاتے ہیں۔ اب ہم زیر بحث موضوع کو اختیار کرنے کی وجوہات بیان کرتے ہیں اور یہ واضح کرنے کی کوشش کریں گے کہ ہزاروں، لاکھوں کتابوں میں سیرت طیبہ کی تفصیلات موجود

ہونے کے باوجود اس موضوع کے انتخاب کی ضرورت پیش کیوں آئی؟ جیسا کہ اس گفتگو کے آغاز میں بتایا گیا کہ سیرت طیبہ کی تفہیم جدید کی شکل کیا ہو سکتی ہے، یا ضرورت کیا ہے کہ سیرت کو ایک نئے پیرائے میں بیان کیا جائے۔
مثال کے طور پر سیرت کی تفہیم کا لب لباب کیا ہوگا، کیا ایسی گنجائش نکل سکتی ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی تعلیمات کو ترمیم کے مراحل سے گزارا جائے، اگر تو یہ اقدام اٹھایا بھی گیا تو اس کی نوعیت کس قسم کی ہوگی، ایک محقق کے لئے یہ ممکن ہوسکے گا کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی تعلیمات اور آپ کی سیرت پر ایک ناقدانہ نظر دوڑائے اور سیرت طیبہ کے بعض پہلوؤں کو لے کر نقد و جرح کی راہ اپنائے؟ بحیثیت محقق ہمارے لئے ہاں کہنے کی گنجائش بھی ہے اور ہمارا جواب نفی میں بھی ہو سکتا ہے۔
اولاً ہمارا جواب ہاں اُس صورت میں ہوگا جب ہم سیرت کے تمام پہلوؤں کو محققانہ انداز سے دیکھیں کہ آیا پیغمبر اسلام ﷺ کی زندگی سے منسوب ہر واقعہ عقلاً، شرعاً اور عرفاً قابلِ یقین ہے؟ اس سلسلے میں ہم مختلف علمی و فنی ذرائع کا سہارا لیں گے اور یہ جاننے کی کوشش کریں گے کہ سیرت طیبہ کے حوالے سے معروف و مشہور ہر واقعہ فی نفسہ درست ہے بھی یا نہیں۔ قرآنی علامات اور تاریخی واقعات کے تناظر میں ہم سیرت طیبہ کے ہر اُس پہلو کو زیر بحث لانے کی ہمت کر سکتے ہیں جو کسی بھی حوالے سے پیغمبر اسلام ﷺ کی زندگی اور آپ کی پیغمبری تعلیمات سے تعلق رکھتا ہے۔ بعدازاں صحت اور عدمِ صحت کے معیار پر رکھ کر بعض واقعات کو رد کر سکتے ہیں اور بعض واقعات کو من و عن قبول کر سکتے ہیں۔ ثانیاً نہیں کہنے کا پورا حق اس لئے ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی تعلیمات اور اقوال آج عصری دنیا میں پہنچے ہیں تو اس کے پسِ پردہ مسلمانوں کے علمی ذرائع ہیں۔
خاص طور پر دو بڑے ذرائع کی موجودگی میں سیرتِ پیغمبر اور واقعاتِ پیغمبر کی وثاقت کو ثابت کرنا کوئی مشکل امر نہیں۔ جبکہ ماضی کے علماء حضرات کی کاوشیں اور علمی جستجو بھی سیرت کے اثبات کے لئے ایک بہت بڑی دلیل ہے۔ اُس وقت کے علماء نے یا تو طویل مسافت اس لئے طے کی ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی تعلیمات اور اقوال کی ترسیل کا کام خوش اسلوبی اور دیانتداری کے ساتھ آگے بڑھایا جائے یا اس لئے سفر پر نکلے ہیں کہ وہ علم کی روشنی سے مستفیض ہو سکیں۔ لہٰذا ان کاوشوں اور کوششوں کے نتیجے میں انکار کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ بدلتے ہوئے حالات اور تقاضے سیرت طیبہ کے تدریجی عمل سے مبرا ہیں۔
یہ بھی بعید ہے کہ تاریخ کی ایک مسلمہ شخصیت (دُنیا کی ایک کثیر آبادی کے نزدیک پیغمبر اسلام ﷺ کی شخصیت مسلمہ اور قابلِ وثوق ہے) کی تعلیمات کو یکسر نظر انداز کر کے اُس کو نقد و جرح کے دائرے میں شامل کیا جائے، خاص طور پر اُن کی شخصیت اور ذات کو ہدفِ تنقید بنانے کا جواز اس لئے بھی نہیں ہو سکتا کہ دُنیا کی ایک کثیر آبادی والی قوم اُن کی حرمت کو اپنے لئے موت اور زندگی کا مسئلہ سمجھتی ہے۔ یہ طبقہ اس اعتقاد کا بھی حامل ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی تعلیمات قدیم و جدید دونوں زمانوں کے لئے آسودہ حال اور بہتر مستقبل کے لئے رہنماء اصول ہیں۔
چونکہ یہ تحقیق سیرت کے اُن پہلوؤں کو سامنے لانے کی سعی ہے جو محقق کی نظر میں تعمیری اور مقتضائے حال ہیں۔
لہٰذا اس میں نقائص سے زیادہ اوصافِ پیغمبر اسلام ﷺ اور عصر حاضر کے لئے رہنماء اصول بیان ہوں گے اور سیرت طیبہ کی روشنی میں جدید مسائل کے حل کی طرف رہنمائی اور نشاندہی کی ایک ادنی سی کوشش ہوگی۔ البتہ اس عنوان سے مطابقت پیدا کرتے ہوئے سیرت پیغمبر اسلام ﷺ کے بعض گوشوں کو تفہیم جدید کی نیت سے زیر بحث لائیں گے اور ہماری یہ بحث تین پہلوؤں سے خالی نہیں ہوگی:
**مبحثِ اول:** مستشرقین سمیت معترضین کے اُن اشکالات کا محاسبہ جو عام طور پر سیرت طیبہ کے بعض پہلوؤں کی ظاہری ہئیت دیکھ کر کئے جاتے ہیں۔ یا بعض ضعیف روایات کو مد نظر رکھ اُن کی سطحی تشریحات کے تناظر میں اشکالات اُٹھائے جاتے ہیں۔ قطع نظر اس کے کہ اُس حدیث یا واقعہ کی فی نفسہ وقعت ہے یا نہیں۔ یا اُسے علم الرجال کے مراحل سے گزارا گیا ہے یا نہیں۔

**مبحثِ دوم:** دین اسلام کے دعویداروں خاص کر عصر حاضر کے شدت پسند افراد کی غلط توجیہات پر نقد و جرح اور اُن کی فہم و استدلال کا محاسبہ۔ بہ نسبت اس کے کہ اسلام کے تابناک چہرے کو متعارف کرایا جائے ، اس گروہ نے اپنی متشدد کارروائیوں کے ذریعے اسلام کے چہرے کو خراب کردیا ہے۔

**مبحثِ سوم:** بعض موارد جیسے غلام و کنیز، جنگ و جدل، مرتد و کافر کے ساتھ سلوک جیسے عامیانہ اُمور کی طرف جدت پسندانہ نظر، کہ کیا ان موارد میں نرمی کی کوئی گنجائش نکل سکتی ہے۔

## معترضین کے اشکالات کا محاسبہ

معترضین (مستشرقین) کے اعتراضات کو تین مختلف حصوں میں بیان کیا جاسکتا ہے۔ ہمیں دیکھنا ہوگا کہ یہ اعتراضات تنقیدی قسم کے ہیں ،اصلاحی نوعیت کے ہیں یا شوقِ مطالعہ کے تناظر میں قائم کئے گئے۔ اس سلسلے میں ہم مستشرقین کو تین گروہ میں منقسم پاتے ہیں:

**پہلا گروہ:** وہ علمائے یورپ جو خود عربی زبان سے واقف نہیں ہیں، لیکن ترجمہ شدہ کتابوں کو منبع قرار دے کر اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں اور مشتبہ مواد ترتیب دے کر اُسے سیرت کا نام دیتے ہیں۔ اس قسم کی کتب چونکہ یورپ کے عامیانہ مزاج کے مطابق تھیں اس لئے زیادہ مقبول ہوئیں اور لوگوں کے سامنے پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرت مجہول انداز میں پیش کرنے کا باعث بنی ہیں۔

**دوسرا گروہ:** وہ دانشور حضرات جنہوں نے محض عربی پڑھ کر خود کو فنِ حدیث، فقہ، تفسیر، سیرت اور مغازی کا بھی ماہر تصور کرلیا۔ یہ حضرات اصطلاحات اور اسلامی اُمور اور سیرت کے بارے میں مغالطے کا شکار ہوئے۔ انہوں نے فرض کرلیا کہ چند واقعات ہی پیغمبر اسلام ﷺ کی زندگی کا کل محاصل ہیں۔

**تیسرا گروہ:** تیسرے گروہ میں وہ مستشرقین شامل ہیں جو عربی زبان کے ساتھ مذہبی علوم سے بھی واقف تھے۔ ان سے اگرچہ عام غلطیاں سرزد نہیں ہوئیں، لیکن ان کا مطالعہ خوردبینی تھا۔ یعنی اُن کے مطالعہ کا مقصد اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرت میں کمزوریاں تلاش کرنا تھا۔ (1)

اکثر مستشرقین نے اپنی مطالعاتی روش ہمیشہ اس بات پر رکھی کہ پیغمبر اسلام ﷺ الٰہی منصب پر فائز فرد نہیں تھے بلکہ آپ نے ماسبق انبیاء کی تعلیمات کو مستعار لیتے ہوئے ایک نئے دین کے قیام کا دعویٰ کیا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی عملی جدوجہد دراصل گذشتہ تبلیغات کی محاصل ہے۔ جیسا کہ مندرجہ ذیل الزامات اس نوع کی مثالیں ہیں۔

آپ نے قرآن کو کلامِ الٰہی قرار دینے کی روش قدیم کتب سے سیکھی، چونکہ آپ کو اندازہ تھا کہ یہود و نصاریٰ کی ترقی کا راز تورات و انجیل میں مضمر ہے اس لئے آپ کے دل میں تمنا پیدا ہوئی کہ ایک ایسی کتاب اپنی قوم کو دیں جسے وہ آسمانی کتاب کے طور پر قبول کرے اور ترقی کی راہیں طے کرے۔ چونکہ عرب کے ماحول میں ایسا کر گزرنا نہایت آسان تھا اس لئے قرآن ان کا ذاتی کارنامہ ہے۔ جیسا کہ بیسوی صدی کے عرب تاریخ کے ماہر امریکی مستشرق (Von Grunebaum) لکھتا ہے:

> "...Islam as a Christian heresy, tells how in the days of the emperor Heraclius a false prophet arose among the Arabs. His name was Mamed. He became acquainted with the Old and New Testaments and later, after discoursing with a Arain monk, established his own sect. By feigning piety, he won the hearts of his people. Later he claimed that a scripture had been sent down to him from heaven. The ridiculous ordinances which he had put into that book he presented to them as their boly doctrine."(2)

"اسلام عیسائیت کی بگڑی ہوئی شکل ہے، شہنشاہ ہرقل کے دور میں ایک ...نبی عربوں میں اُٹھا، اس نے عہد نامہ قدیم وجدید سے واقفیت حاصل کی اور پھر ایک ایرین راہب سے تبادلہ خیال کے بعد اپنا ایک فرقہ قائم کیا۔...پاکبازی کے ذریعے اس نے لوگوں کے دل جیتے۔ بعد میں اس نے دعویٰ کیا کہ آسمان سے اس پر ایک صحیفہ نازل ہوا ہے اور ان تمام ....احکام کو جو اس نے کتاب میں تحریر کر رکھے تھے، اپنی قوم کے لئے مقدس تعلیمات قرار دیا۔"

اسلام کی انفرادی حیثیت کی نفی کرتے ہوئے یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ اسلام دراصل مختلف مذاہب کا اشتراک ہے۔ یہ یہودیت اور عیسائیت کی مثل ہے۔ اسلام کے محمد نے مروجہ مذاہب کا مطالعہ کیا اور اُن کی تعلیمات کو سامنے رکھتے ہوئے احکامات و عبادات نافذ کئے۔ جیسا کہ دعویٰ کیا گیا ہے:

"اسلام کے ارکان دوسرے مذاہب سے مستعار ہیں۔ توحید اور عبادات یہودیت اور عیسائیت سے، حج مشرکین عرب سے، طوافِ کعبہ، حجر اسود کا بوسہ اور جانوروں کی قربانی مقامی مذاہب سے مفاہمت کی نشانی ہے۔ پس اسلام مختلف مذاہب کا اشتراک ہے۔"(3)

عام طور پر حج کے بارے میں یہ باور کرایا جاتا ہے کہ یہ مشرکین عرب کی ایک رسم تھی، جسے اسلام نے مقامی اثرات کے تحت یا مشرکینِ عرب کو خوش کرنے کے لئے اپنا لیا۔ واٹ نے اس کی ترجمانی یوں کی ہے:

"When one religion replaces another, it usually finds it advantageous to take over the previous observance of sacred places and sacred times and gives it justification from its own tradition. In Islam pre-Islamic rites connected with the pilgrimage to Mecca have been taken over in their external forms, but have been given an Islamic significance."(4)

"جب ایک مذہب دوسرے کی جگہ لیتا ہے تو عموماً اسے پچھلے مذہب کے مقدس مقامات اور مقدس ایام کو اپنانے میں فوائد نظر آتے ہیں، لیکن ان ماخوذ چیزوں کو نیا مذہب اپنی تاویلات دیتا ہے۔ اسلام میں زمانہ قبل از اسلام کی مکہ کی زیارت کی رسوم اپنی ظاہری شکل میں اپنالی گئ ہیں لیکن انہیں اسلامی اہمیت دے دی گئ ہے۔"

توجہ اس امر کی طرف مبذول کرانے کی ضرورت ہے کہ حج، خانہ کعبہ، طواف اور قربانی کا احترام ابتدائے اسلام سے ہی پایا جاتا ہے۔ سورہ قریش جو ابتدائی مکی سورتوں میں ہے، خانہ کعبہ کو بیت اللہ قرار دیتی ہے۔ سورہ کوثر قرآن کی مختصر ترین سورہ جو مکی ہے اس میں نحر یعنی قربانی کا حکم موجود ہے۔ اسلام میں قربانی کا تعلق صرف حج سے ہے۔ کسی اور عبادت کے ساتھ قربانی وابستہ نہیں۔ مکی دور میں پیغمبر اسلام ﷺ اور آپ کے ساتھیوں کے طوافِ کعبہ کے تذکرے موجود ہیں۔

ہجرتِ مدینہ سے قبل انصار سے دو مرتبہ بیعت لی گئ۔ یہ دونوں بیعتِ عقبہ کہلاتی ہیں۔ یہ کس مقام پر ہوئیں۔ کیا عقبہ منیٰ کی ایک گھاٹی کا نام نہیں اور منیٰ صرف حج کے دوران آباد ہوتا ہے۔ اگر پیغمبر اسلام ﷺ اور ان کے اصحاب عقبہ میں موجود تھے تو یہ کیسے باور کیا جاسکتا ہے کہ مناسک حج ادا کرنا مقصود نہیں تھا۔ تبلیغ تو اور مقامات پر بھی ہوسکتی تھی کہ شرکائے حج، حج سے پہلے اور حج کے بعد مختلف بازاروں اور میلوں میں خاصی مدت قیام کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ حج کے واضح احکامات موجود نہ ہونے کے باوجود ہجرت سے قبل بھی حج کو اسلامی عبادت کا مرتبہ حاصل تھا۔

قرآن مجید کے بارے میں مستشرقین کو یہ گمان تھا کہ وہ کلام سنی سنائی باتوں پر مشتمل ہے۔ یہ پیغمبر اسلام ﷺ کی ذاتی تصنیف ہے۔ اس کی تعلیمات غیر مکمل اور اخلاقیات ادھورے ہیں۔ کارلائل جیسے لوگ ایک طرف پیغمبر اسلام ﷺ کو نہ صرف تاریخ بشریت کے عظیم رہنماء

قرار دیتے ہیں وہی دوسری طرف قرآن پر لکھنے بیٹھ جاتے ہیں تو اُن کا ذہنی توازن ڈگمگا جاتا ہے اور خیالات و نظریات منتشر نظر آتے ہیں۔ وہ لکھتا ہے:

"As toilsome reading as I ever undertook, a wearisome confused jumble, crude, incondite, endless iterations, long-windedness, entanglements, most crude incondite, insupportable stupidity; in short nothing but a sense of duty could carry any European through Koran." (5)

"میری زندگی کی سب سے زیادہ محنت طلب خواندگی ایک اُکتا دینے والا، پریشان، بے ترتیب مجموعہ، خام، ناپختہ، لامتناہی تکرار، طول طویل گفتگو، الجھاؤ، انتہائی خام اور غیر نفیس، ناقابل دفاع حماقت، مختصر یہ کہ سوائے ادائے فرض کے احساس کے کسی یوروپین کو کوئی چیز قرآن کو پڑھنے پر آمادہ نہیں کر سکتی۔"

مستشرقین نے اسلام کی تبلیغی و ترسیلی مساعی کو تلوار کے مرہون منت قرار دیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ عیسائی مذہب کی بقاء کا تمام تر دار و مدار اس بات پر رکھا گیا ہے کہ کسی بھی طرح سے اسلام کی تضحیک ہو جائے اور اسلام کو عیسائیت یا یہودیت کے سائے میں رکھا جائے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کو بزورِ شمشیر پھیلانے کا شاخسانہ عیسائیت کا وضع کردہ دفاعی نظریہ ہے۔ اس کے ذریعہ صرف یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ اسلام کی مقبولیت اس کی حقانیت کا نہیں بلکہ مسلمانوں کے جبر کا نتیجہ ہے۔ اس حقیقت کا اعتراف مستشرقین نے کیا ہے۔ چنانچہ برائن ٹرنر (Bryan Tuner) نے لکھا ہے:

"In order to explain the spread of Islam, Christian theology developed a defensive theory, which demonstrated that Islamic success was the product of Muslim violence, lasciviousness and deceit." (6)

"اسلام کی توسیع کی وضاحت کرنے کے لئے عیسائی مذہب نے ایک دفاعی نظریہ پروان چڑھایا، جو بیان کرتا تھا کہ اسلام کی کامیابی، مسلمانوں کے تشدد، شہوت رانی اور فریب کاری کا نتیجہ ہے۔"

پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں مستشرقین کا نظریہ بڑا جارحانہ اور حوالوں سے عاری ہوتا ہے۔ ظاہری واقعات اور معاملات کو سامنے رکھتے ہوئے اس بات کے مدعی نظر آتے ہیں کہ ایک طرف پیغمبر اسلام ﷺ مکی زندگی میں نبوت کی اعلیٰ شان پر فائز تھے تو دوسری طرف مدنی زندگی کی شناخت الگ وضع قطع سے ظاہر ہوئی۔ جیسا کہ مشہور مستشرق ویبر لکھتے ہیں:

"His position in Medina, which was between that of an Italian Podesta and that of Calvin in Geneva, grew primarily out of his purely prophetic mission. A merchant, he was first a leader of pietistic conventicles in Mecca, until he realized more and more clearly that the organization of the interest of the Warrior Clans in the acquisition of the booty was the external basis provided for his missionizing."(7)

"مدینہ میں ان کی حیثیت اطالیہ کے پودستا (شہر کے امیر اور حکمراں) اور جینیوا کے کالوِن (پروٹسٹنٹ فرقے کے ایک شہری اور دینی ناظم) کے بین بین تھی، جس نے بنیادی طور پر ان کے خالصتاً پیغمبرانہ نصب العین سے نمود پائی تھی۔ وہ ایک تاجر، اور مکہ میں پرہیزگارانہ اجتماعات کے رہبر تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اس بات کا واضح سے واضح تر طور پر ادراک کیا کہ جنگجو قبائل کی حصول مالِ غنیمت میں دلچسپی کا لحاظ، ان کے نصب العین کی خارجی بنیاد ہونی چاہیے۔"

نکلسن نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"When by force of circumstances, the Prophet in him had grown into the ruler and legislator, it was a psychological necessity he should still feel himself to be chosen medium of the divine message."(8)

"جب حالات کے جبر کے تحت پیغمبر ایک حکمراں اور قانون ساز میں ڈھل گئے تو بھی یہ ایک نفسیاتی ضرورت تھی کہ وہ خود کو الہامی پیغامات کا منتخبِ ذریعہ سمجھتے رہیں۔"

اس کے باوجود وہ مستشرقین جو اگرچہ عربی زبان و ادب اور مسلمانوں کے علمی ذخائر سے بہت زیادہ واقف نہ تھے لیکن اس کے باوجود اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں لب کشائی کی اور آپ کی دینی و علمی مساعی کے معترف ہوئے۔ انیسویں صدی کے معروف فلسفی، تاریخ دان اور تنقید نگار تھامس کارلائل (Thomas Carlyle) لکھتے ہیں:

"Ah, no! This deep hearted son of the wilderness, with his beaming black eyes and open social deep soul, had other thought in him than ambition. A silent great soul, he was one of those who cannot but be in earnest, whom nature herself had appointed to be sincere."(9)

"ارے نہیں، صحرا کے یہ گداز دل فرزند، اپنی مسکراتی سیاہ آنکھوں اور ہر ایک کے لئے گہری محبت رکھنے والی روح کے ساتھ خود نمائی سے بہت ہی مختلف خیالات کے حامل تھے۔ ایک خاموش فطرت، عظیم نفس، وہ ان لوگوں میں سے تھے جو سوائے لگاؤ کے کچھ اور برت ہی نہیں سکتے تھے اور جن کو خود فطرت نے بطور خاص خلوص کے لئے ہی مقرر کیا تھا۔"

تھامس کو اس بات کا ادارک تھا کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی شخصیت ایسی نہیں ہے جس قسم کی شبیہ مغربی مفکرین پیش کرتے ہیں۔ اُن کے نزدیک پیغمبر اسلام ﷺ کی ذات تمام دُنیاوی لذات سے بے نیاز تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

"We shall err widely if we consider this man as a common voluptuary, intent mainly on base enjoyments, nay on enjoyment of any kind."(10)

"ہم بہت بڑی غلطی کریں گے اگر ہم ان صاحب (پیغمبر اسلام ﷺ) کو ایک ایسا عام لذت پسند شخص گردانیں گے جو بنیادی طور پر گھٹیا عیش کوشی پر مائل ہو (جبکہ وہ) کسی بھی قسم کی لطف اندوزی سے گریز کرتے تھے۔"

کارلائل نے اپنے دور تک کے مغربی اندازِ تحریر کو شرمناک قرار دیا اور برملا کہا کہ یہ تصور کہ عرب کے نبی ایک منصوبہ ساز بہروپیے تھے (نعوذ باللہ) یا ان کا دین خرافات کا مجموعہ تھا، اب کسی طور قابل قبول نہیں، جانتے بوجھتے کذب و افتراء کا جو طوفان ان کے خلاف اٹھایا گیا ہے وہ مغرب کے لئے باعثِ ننگ ہے۔ پھر اس نے مغربی اہل فکر کو اپنے دل ٹٹولنے کی دعوت دی کہ ان کی زبان سے ادا ہونے والا ہر لفظ گذشتہ کئی صدیوں سے کروڑوں افراد کی زندگی کی رہنمائی کرتا ہے۔

کیا یہ باور کیا جاسکتا ہے کہ یہ سب کچھ (ظہورِ اسلام) محض ایک کربناک روحانی فریب تھا جس کے لئے قادرِ مطلق کی مخلوق کی اتنی بڑی تعداد نے اپنی زندگی وقف کی اور ہنستے کھیلتے موت کو گلے لگالیا۔ کارلائل نے کہا کہ وہ ایسے کسی مفروضے سے متفق نہیں ہو سکتا۔ کارلائل وہ پہلا مغربی فرد ہے جس نے اپنے معاشرے کے برخلاف یہ اعلان کیا:

"The man's words were not false, nor his workings lure below, no inanity and simulacrum, a fiery mass of life acast-up from the great bosom of nature herself.....The words of such a man is voice direct from nature's own heart."(11)

"ان صاحب (پیغمبر اسلام ﷺ) کے الفاظ دروغ نہیں تھے نہ ہی ان کے طرزِ عمل میں کوئی چال، کھوکھلا پن یا مصنوعی بھرم تھا۔ وہ تو زندگی کی حرارت سے بھرپور ایک وجود تھے جس نے فطرت کی اپنی کوکھ سے جنم لیا تھا...ایسے شخص کے الفاظ تو فطرت کے اپنے دل کی آواز ہوتے ہیں۔"

برطانوی مفکر اور تاریخ دان ہنری اِسٹب (Henry Stubb) بھی اس قسم کے جذبات کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ پیغمبر اسلام ﷺ اور مسلمانوں کو اس قدر بُرا خیال نہیں کرتے جس قسم کے خیالات دیگر مستشرقین کے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"It is certain that the Christains which lived under the Mahomatens, do mention Mahomet with great respect as Mahomet of glorious Memory, and Mohometan super quo pax and benedictis & C." (12)

" یہ بات قطعی ہے کہ جو عیسائی محمدیوں کے زیر نگیں رہے ہیں وہ محمد کا ذکر نہایت احترام سے کرتے ہیں جیسے عظیم یادوں والے محمد اور عظیم المرتبت امن اور برکتوں والے محمد وغیرہ۔ "

بہر حال مُستشرقین کی تحقیقی کاوشیں بہت ہی سطحی اور جانب دارانہ نوعیت کی تھیں۔ انہوں نے خالصتاً پیغمبر اسلام ﷺ کی ذات کو تنقید کے زیر اثر رکھنے کے لئے تحقیقات و تالیفات کیں جس کالازمی نتیجہ یہ نکلا کہ پیغمبر اسلام ﷺ کے خلاف اُن کا عمومی رویہ جارحانہ ثابت ہوا۔

اس کے علاوہ بھی کئی اعتراضات اور اشکالات مستشرقین کی طرف سے ہیں، ہم طوالت کلام سے بچنے کے لئے انہی چند اعتراضات پر اکتفا کرتے ہیں۔ مستشرقین کے اعتراضات کا بغور جائزہ لیا جائے تو تحقیق سے زیادہ جذباتیت اور اپنے مذہب کے اثبات کی چھلک نظر آتی ہے۔ جن کتب کو بنیاد بنا کر کہ وہ قابلِ اعتبار نہیں انہی کتابوں سے چیدہ چیدہ نکات بیان کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی زندگی جہاں بہت ساری جہتوں سے قابلِ گرفت ہے وہی قرآن جیسا الہام پیغام بھی کسی قدر قابل بھروسہ نہیں ہو سکتا۔

مستشرقین نے ہمیشہ سے پیغمبر اسلام ﷺ کو تاریخ کے ناقابل اعتبار واقعات میں تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ احادیث نبویہ کو نقد و جرح کے مرحلے سے گزرا ہے۔ یہاں تک کہ پیغمبر اسلام کی شخصیت کو بھی متنازعہ نگاہوں سے دیکھا ہے۔ اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ سے منسوب ہر واقعہ یا حدیث مستند اور قابل وثوق ہو۔ بلکہ سیرت کی کتابوں میں بعض ایسے واقعات بھی ملتے ہیں جو یقیناً پیغمبر اسلام ﷺ کی شخصیت اور آپ کی ذمہ داری سے مطابقت نہیں رکھتے۔ مستشرقین نے بھی زیادہ تر ایسے واقعات کو ہی مرکزِ نگاہ رکھا ہے۔

ان کا سب سے بڑا اعتراض ہی یہی ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ خود کوئی نیا دین لے کر نہیں آئے تھے بلکہ اُس وقت کے رائج مذاہب یہود و نصاریٰ ( جن کی تعداد مکہ میں نہ ہونے کے برابر تھی ) سے سیکھتے ہوئے ایک جدید مذہب کی آمد کا اعلان کر دیا۔ قبل از اسلام اگر ہم عرب کے جغرافیائی اور سیاسی حالات پر نظر رکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کی مکی زندگی یہود و نصاریٰ کے لئے کوئی قابل ذکر نہ تھی۔ وہ معدودے چند افراد پر مشتمل تھے۔ اُن کا نہ سیاسی اثر تھا اور نہ ہی تجارتی بڑھوتری حاصل تھی۔ تاریخ میں ورقہ ابن نوفل کا نام ملتا ہے کہ انہوں نے پیغمبر اسلام ﷺ کو جبرائیل امین سے ہونے والی ملاقات کی کیفیت بتائی تھی اور کہا تھا کہ عنقریب آپ منصب نبوت پر فائز ہونے والے ہیں۔

پیغمبر اسلام ﷺ سے ورقہ ابن نوفل کی ملاقات کو بنیاد بنا کر مستشرقین قرار دیتے ہیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ دراصل عیسائیت سے واقف تھے اور آپ نے دین اسلام کو مذہب عیسائیت سے مستعار لیا ہے۔ جبکہ دوسری جانب ہم یہودیوں کی سیاسی رہبری کی طرف نظر کرتے ہیں تو مکہ میں کوئی ایسی شخصیت نمایاں نظر نہیں آتی کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے اُن سے ملاقات کی ہو اور الٰہی رموز سے واقفیت حاصل کی ہو۔ کم از کم مکی زندگی میں تو ہمیں نہ تو عیسائیت کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں اور نہ ہی یہودیوں کا اثر و رسوخ، پھر کیسے مان لیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے دین اسلام کی تمام تر تعلیمات کو یہود و نصاریٰ سے مستعار لی ہیں۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی جدوجہد اور تبلیغ مکمل طور پر الٰہی منصب دار تھی۔ آپ کو اُن تمام ادیان جو آپ سے قبل رائج تھے، کے بارے میں معلوم تھا تو یہ اللہ کی طرف سے ودیعت کردہ صلاحیت تھی نہ کہ کسی دنیاوی فرد کی طرف سے تفویض کردہ نیابت، مسلمان مفکرین سمیت مستشرقین بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ آپ پڑھے لکھے نہ تھے۔ اگر کسی عیسائی یا یہودی سے دینی تعلیمات مستعار لی بھی ہیں تو پھر یہ تو تسلیم کرنا پڑے گا کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی شخصیت نابغہ روزگار تھی۔ علم سے نابلد ایک شخص ایک مختصر سی مدت میں اتنے بڑے دین کو پھیلانے میں کیسے کامیاب ہوا۔ یہ سوال بذات خود ان معترضین کے لئے جواب ہے۔

## شدت پسندوں کی توجیہات کا محاسبہ

باوجود اس کے کہ سیرت طیبہ میں انسانی ہمدردی کا پہلو ہمیشہ بلند اور ارجح رہا ہے، لیکن اس پہلو پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ سیرت پیغمبر اسلام ﷺ کی غلط تعبیرات اور تشریحات کیونکر عام ہوئیں؟ یہ کہہ کر بری الذمہ نہیں ہوا جاسکتا کہ یہ سب کچھ دشمنوں کی چال ہے اور مغربی مفکرین نے مفروضوں کی بنیاد پر پیغمبر اسلام ﷺ کی ذات سے وابستہ کر رکھا ہے۔ یہ تو تاریخ کے ہر طالب علم جانتا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرت میں ہمدردی اور بھائی چارگی نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔، لیکن تصویر کا دوسرا رُخ بھی ہے کہ بعض ایسے واقعات جن کی نسبت پیغمبر اسلام ﷺ کی طرف دی جاتی ہے، اُن کو بنیاد بنا کر نہ صرف جواز کا راستہ نکالا جاتا ہے بلکہ عملاً اس کا مظاہرہ بھی کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ جہاد و قتال، جنگ وجدل اور غیر مسلموں سے غلاموں اور کنیزوں جیسا رویہ پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرت کے گوشے شمار کئے جاتے ہیں۔ خاص طور پر غیر مسلموں کے خلاف جارحیت خواہ وہ کسی بھی صورت میں ہو رہا ہے۔ حالانکہ اگر اعلانِ نبوت سے لے کر آپ کے وصال تک کی ۲۳ سالہ زندگی کو مختلف کاموں پر تقسیم کرکے دیکھا جائے تو بڑے حیرت انگیز انکشافات ہوں گے۔

مثال کے طور پر آپ نے جتنے غزوات میں شرکت فرمائی اگر ان سب کو جمع کرکے ان کے گھنٹے اور دن بنا لیے جائیں تو معلوم ہوگا کہ ان ۲۳ برسوں میں صرف چھ ماہ ایسے ہیں جن میں آپ کے ہاتھ میں تلوار ہے، گویا ساڑھے بائیس سال میں آپ یا تو لوگوں کے ساتھ عدل وانصاف فرمارہے ہیں، یا پھر غریبوں اور مسکینوں کو مال تقسیم فرمارہے ہیں، یا لوگوں کے درمیان مساوات قائم فرمارہے ہیں۔ کبھی غلاموں، مزدوروں اور یتیموں کے ساتھ حسن سلوک فرمارہے ہیں اور اپنے ساتھیوں کو بھی ایسا ہی کرنے کا حکم فرمارہے ہیں، کبھی آپ عورتوں اور بیواؤں کے حقوق کے سلسلہ میں لوگوں کو متنبہ فرمارہے ہیں۔اب اگر آپ ان ٦ ماہ (جن میں آپ کے ہاتھ میں تلوار ہے) سے ان ساڑھے بائیس سال کا موازنہ کریں تو ایک نئی دنیا کی سیر ہوگی۔ یہاں یہ بات بھی دیکھنے کی ہے کہ ان چھ مہینوں میں بھی آپ نے لوگوں کو ظلم وزیادتی سے بچانے کے لئے اور فتنہ وفساد رفع کرکے امن کے قیام کے لیے تلوار اٹھائی ہے۔

عصر حاضر میں سیرت کی تفہیم جدید کا تمام تر دارومدار ان ساڑھے بائیس برسوں پر ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ کے کس کردار سے روشنی ملتی ہے کہ خواتین، بچوں اور بزرگوں کو ذبح کیا جائے، ان کی جائیدادیں ہتھیالی جائیں، یہاں تک کہ کلمہ گو افراد کو تکفیریت سے منسوب کرکے ان کا قتل عام کیا جائے۔ ان شدت پسندوں کے اعمال کا تعلق یقیناً ان واقعات سے ہے جنہیں پیغمبر اسلام ﷺ کی مدنی زندگی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ من جملہ ان میں سے ایک واقعہ بنو قریضہ کا ہے۔ یہ قبیلہ مدینہ میں آباد تھا۔میثاق مدینہ کی روشنی میں دیگر قبائل کی طرح اس قبیلے کو بھی امنیت حاصل تھی اور پیغمبر اسلام ﷺ کی سربراہی میں مدینہ کی حفاظت اور دیگر اُمور میں اِن کو مسلمانوں کا ساتھ دینا تھا۔

مسلمان مفکرین کے مطابق غزوہ خندق کے موقع پر اس قبیلے نے عہد شکنی کی اور مسلمانوں کے دشمنوں کے ساتھ ساز باز کرکے مدینہ پر حملہ کرنے کی پوری تیاری کرلی تھی۔ باوجود کہ انہوں نے پیغمبر اسلام ﷺ سے معاہدہ کر رکھا تھا کہ جب بھی بیرون مدینہ سے کوئی حملہ آور ہوگا تو وہ مسلمانوں کا ساتھ دیں گے۔ لیکن جب جنگ کا مرحلہ آیا تو انہوں نے نہ مسلمانوں کا ساتھ دیا اور نہ ہی مدد کرنے کی سعی کی۔ معاہدے کی خلاف ورزی کے نتیجے میں پیغمبر اسلام ﷺ نے ان کے قلعہ کا محاصرہ کرلیا اور بعد ازاں سخت ترین سزا دیتے ہوئے ان کی خواتین اور بچوں کو غلام بنالیا جبکہ مرد حضرات کو قتل کردیا گیا۔

اگرچہ یہ واقعہ تاریخ اسلام میں معروف ہے لیکن کئی طرح سے محل نظر ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ کی بعثت سے قبل اس طرح کے واقعات عام تھے۔ فریق مخالف پر فتح کے بعد ان کی عورتوں اور بچوں کو کنیز وغلام بنانا اور اُن کے مردوں کو قتل کرنا عام رواج تھا۔ اگر تو ہم پیغمبر اسلام ﷺ کو ایک مصلح اور جدیدیت کے روپ میں دیکھتے ہیں تو پھر پیغمبر اسلام ﷺ کو ایک ایسے واقعہ کو دہرانے کی ضرورت کیوں پیش آئی جس کی بیخ کنی کے لئے آپ کو مبعوث کیا گیا تھا۔ اسلام کے نقطہ نظر سے قتل کی نوبت اس وقت تک نہیں آتی جب تک کہ فریق مخالف آپ کی جان کے درپے نہ ہو۔ معاہدہ کی خلاف ورزی کوئی بڑا جرم نہیں تھا کہ پورے کا پورا قبیلہ یا تو کنیز وغلام بنے یا قتل کردیئے جائیں۔

کہاں تو پیغمبر اسلام ﷺ کی ذات سے منسوب رحمت پر مبنی واقعات کہ اگر دشمن بھی معافی تلافی کا طلب گار ہو تو فی الفور معاف کرنے والے اور کہاں اس قسم کی سخت فیصلے کہ ایک معاہدے کی خلاف ورزی پر پورا قبیلہ تہہ وتیغ کیا جائے۔ مسلمانوں کے پاس اس واقعہ کے اثبات کے لئے چند دلائل ہیں۔ ان کے نقطہ نظر سے چونکہ اس وقت اسلامی ریاست خطرے میں تھی اور پیغمبر اسلام ﷺ کو خدشہ تھا کہ ان کی سازش کے نتیجے میں مسلمان سخت مشکلات میں گھِر سکتے ہیں۔ اگر اس دلیل کو ہم مان لیں تو پھر پیغمبر اسلام ﷺ کی زندگی کا کون سا ایسا دن ہے جو خطرے سے خالی نہیں تھا۔ آپ کی تبلیغی خدمات ہمیشہ سے پر خطر اور نامساعد حالات کا شکار رہی ہیں۔

اس ایک واقعہ کی وجہ سے ہم پیغمبر اسلام ﷺ کے خاص لقب جس کو قرآن میں بھی بیان کیا گیا ہے پس پشت نہیں ڈال سکتے۔ آپ کو رحمت بنا کر بھیجا گیا تھا۔ دشمن کو معاف کرنا اور ان کی اصلاح کرنا آپ کی زندگی کا منشا و مقصد تھا نہ کہ قتل و غارت گری۔ چونکہ یہودیوں نے دشمن سے ساز باز کرلی تھی اس لئے ضروری تھا کہ آئندہ کے لئے ایک ایسا راستہ متعین کیا جائے کہ دوبارہ کسی کو جرأت نہ ہو۔ ہم اس دلیل کو بھی قبول نہیں کر سکتے۔ پیغمبر اسلام ﷺ کی ذات اس قسم کی نسبت سے مبرا ہے۔ ایک ہی وقت میں قریب سات سو افراد کا قتل ناممکنات میں سے ہے۔ آج کے شدت پسند اگرچہ اس قسم کے واقعات سے سہارا لیتے ہیں لیکن تصویر کا دوسرا رُخ بھی ہر وقت رہے گا کہ کیا اس واقعہ کے علاوہ کوئی اور بھی واقعہ پیغمبر اسلام ﷺ سے منسوب ہے؟ ہم دیکھتے ہیں کہ آپ کی زندگی کے دیگر واقعات میں اس طرح کی مثال نہیں ملتی۔ عصر حاضر میں ان واقعات کی از سر نو تفہیم کی ضرورت ہے۔ قرآنی لب و لہجہ اور سیرت پیغمبر اسلام ﷺ اس واقعہ سے بالکل الگ روش رکھتے ہیں۔ قرآن آپ کو عالمین کے لئے رحمت قرار دیتا ہے جبکہ خود پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرت ایک رحم دل اور دردمند انسان کے روپ میں پیش کرتی ہے۔ لامحالہ ان واضح دلائل کی موجودمیں کسی تیسری توجیہ کی ضرورت پیش نہیں آنی چاہیے۔

**عامیانہ اُمور:** سطور بالا میں درج کئے گئے نکات کو سامنے رکھیں تو سیرت طیبہ کی تفہیم جدید کی ضرورت نہ صرف یکبارگی پیش آئے گی بلکہ بار بار تفہیم جدید کا دروازہ کھلتا ہوا نظر آئے گا۔ ہمارے تئیں سیرت ایک وسیع موضوع ہے اور ظاہر ہے کہ اس کا ایک گوشہ موجودہ دور کے تمام تر انسانی مسائل کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ لہٰذا ہمیں اُن تمام تر پہلوؤں کو باریک بینی سے بیان کرنا ہوگا جن کی ظاہری شکل اور تعبیر کو بنیاد بنا کر معترضین سوال اُٹھاتے ہیں، اُن کو لائقِ گرفت سمجھتے ہیں اور موجودہ دور کے مسائل کے بہتر حل کے لئے موزوں نہیں گردانتے۔ دوسری جانب اُن پیروکاروں کی توجیہات کو بھی نقد و جرح کے دائرے میں لانا ہوگا جو کم علمی اور ظاہری معنی کے چنگل سے باہر نہیں نکلتے ہیں اور اپنے مقاصد کے حصول کے لئے سیرت طیبہ سے منسوب چند واقعات کو بنیاد بنا کر اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرت کی بدنامی کا باعث بنتے ہیں۔

آج کے دور میں سیرت طیبہ کو سمجھنے اور عملی زندگی میں اپنانے کے لئے دو بڑے گروہ ہیں۔ ایک گروہ مخالفین کا ہے جن کی تفصیلی بحث سطور بالا میں گزر چکی ہے۔ ان کی نظر میں سیرت طیبہ متنازع ہے اور آج کے دور میں اس کی عملی تصویر بنتی نظر نہیں آتی۔ ان کے خیال میں پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرت کا تعلق اُن کے اپنے دور سے تھا۔

جدید دُنیا میں سیرت کی پیروی کی ضرورت نہیں۔ بعض مخالفین کے نزدیک پیغمبر اسلام ﷺ کی شخصی زندگی دراصل محدود لوگوں اور معاشرے تک تھی، بلکہ صرف عربوں کے لئے لائق تقلید تھی۔ دوسرا گروہ حامیوں کا ہے، اس گروہ کے خیال میں پیغمبر اسلام ﷺ سے منسوب ہر واقعہ یا عمل فی نفسہ درست ہے اور موجودہ دور کے مسلمانوں کے لئے لائق تقلید ہے۔ اس گروہ کے نظریات غیر مسلموں کے ساتھ ساتھ اپنے مخالف فرقے کے لئے متشددانہ ہیں۔ اپنے فریق کو نہ صرف دین اسلام سے خارج قرار دیتے ہیں بلکہ واجب القتل سمجھنے میں بھی تامل نہیں کرتے۔ لہٰذا ان دو مختلف گروہوں کی موجودگی میں لازم ہو جاتا ہے کہ سیرت کو ایک نئے پیرایئے میں بیان کیا جائے۔

سیرت کی تفہیم کی ضرورت کا اصل میں بنیادی نظریہ یہ ہے کہ آج لوگ کہتے ہیں کہ وہ چیزیں جو ہماری قدیم ہیں، روایتی ہیں، اور ایک طرح سے فرسودہ ہیں، ان چیزوں کے اندر بہت سی ایسی چیزیں ہیں جو آج کے دور میں عملاً نافذ نہیں ہو سکتی۔ تو ان چیزوں کو جدید دور کے جو تقاضے

ہیں ان کی روشنی میں دوبارہ دیکھا جائے، تشکیل نو کی جائے۔ اس کے لئے کیا کرنا ہوتا ہے جو ہمارے ذرائع ہیں ان کو دوبارہ نئے سرے سے پڑھ کر دیکھا جائے کہ ان کا مطلب کیا وہی جو پرانے لوگ لیتے تھے۔ یا کوئی نیا مطلب نکلتا ہے جس سے ہمیں زیادہ بہتر دین کا فہم حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ چیز قرآن میں بھی، حدیث میں بھی، ہر جگہ دیکھیں گے کہ تشکیل جدید کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق ایک مرتبہ اور دیکھیں۔ ہم نے اس سے قبل قرآن بہت پڑھا ہوگا، اس موضوع کی روشنی میں دوبارہ قرآن پڑھ کے دیکھیں تو جب انسان دوبارہ پڑھ کے دیکھتا ہے تو اس کے سامنے کئی راہیں کھلتی ہیں۔

مثال کے طور حقوقِ انسان کی اصطلاح بظاہر نہ قرآن میں ہے اور نہ ہی سیرت طیبہ میں ملے گی۔ کیونکہ قرآن یا پیغمبر اسلام ﷺ نے انسانی حقوق کا نام لے کر نہیں کہا کہ انسان کے حقوق یہ ہیں یا وہ ہیں۔ بلکہ اصول کی نشاندہی کی ہے۔ تو ہم کیسے سمجھیں کہ اسلام اور سیرت پیغمبر اسلام ﷺ میں سیرت کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں پھر سے سیرت طیبہ کو زندہ کرنا ہوگا اور پرکھنا ہوگا کہ آیا قرآن اور سیرت کی کتابوں میں اُن واقعات کی کثرت ہے جن میں پیغمبر اسلام ﷺ کی رحمت نظر آتی ہے یا وہ واقعات زیادہ ہیں جن میں پیغمبر اسلام ﷺ کی سخت روش کا تذکرہ ہے۔ ہم ذیل میں چند بنیادی موضوعات کو زیر بحث لاتے ہیں۔

**مقامِ انسانیت:** عام طور پر پیغمبر اسلام ﷺ سے منسوب ایک طرح سے الزام ہے کہ آپ کی نگاہ میں انسانیت کی برابری کا تصور مبہم تھا۔ آپ مرد اور عورت کے درمیان مساویانہ عمل قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ مخالفین سمیت حامی بھی بعض موارد کی روشنی میں اس مغالطے کا شکار ہوئے کہ اسلام میں غلام و کنیز اور خواتین کی کمتری کا تصور پیغمبر اسلام ﷺ کی طرف سے تفویض کردہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کی متمدن دنیا میں بھی مسلم شدت پسند غلامی اور کنیزی کا تصور لئے بیٹھے ہیں اور خواتین کو وہ حقوق دینے کے لئے تیار نہیں جن کی دعویدار متمدن دنیا ہے۔

لیکن جب ہم پیغمبر اسلام ﷺ کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں کئی ایسے موارد نظر آتے ہیں جہاں آپ ایک غلام (زید بن ثابت) کو کبھی اپنا منہ بولا بیٹا بناتے ہوئے نظر آتے ہیں، کبھی کسی غلام کو شعائر اسلام کی ادائیگی کی ذمہ داری سونپتے ہیں۔ (حضرت بلال ایک حبشی غلام تھے اور کفار قریش کے مظالم کے ستائے ہوئے ایک مظلوم کی حیثیت سے پیغمبر اسلام ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے، آپ نے ان کو موذن مقرر کیا تھا) کبھی کسی غلام (سلمان فارسی) کو اپنے اہل خاندان میں سے قرار دیتے ہیں۔

عرب کے اُس معاشرے میں جہاں پر انسانیت کی کوئی قدر و قیمت نہیں تھی وہاں آپ نے ایک غلام کو عزت بخشی اور اسلامی نظام زندگی میں شامل کرتے ہوئے بڑی بڑی ذمہ داریاں سونپی۔ مخالفین کی اس منطق کی کوئی توجیہ سمجھ میں نہیں آئی کہ انہوں نے کس بنیاد پر پیغمبر اسلام ﷺ کو مقامِ انسانیت سے ناآشنا قرار دیا۔ یا حامیوں کی اس منطق سے بھی مطمئن ہونے کا کوئی جواز نہیں کہ آج کے دور میں بھی انسانیت غلام، کنیز یا نچلے طبقہ میں شمار ہو سکتی ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ کے اعلان کے مطابق تمام انسان برابر ہیں، سب اللہ کی مخلوقات ہیں اور ہر انسان نے اپنے جینے کا حق اللہ سے لیا ہوا ہے۔ کسی انسان کو حق نہیں پہنچتا کہ وہ اپنے جیسے انسان کو ذات پات کی بنیاد پر ذلیل و خوار سمجھے۔ پیغمبر اسلام ﷺ کے سامنے آپ کے چچا حضرت حمزہ کو بے دردی کے ساتھ قتل کرنے والا حبشی اسلام قبول کرنے کی غرض سے آیا تو آپ نے اس کے ساتھ کوئی برا سلوک نہیں کیا۔ جیسا کہ صحیح بخار میں ذکر ہے:

....قَالَ: حَتَّى قَدِمْتُ عَلَى رَسُولِ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلَمَّا رَآنِي قَالَ: «آنْتَ وَحْشِيٌّ». قُلْتُ نَعَمْ. قَالَ: «أَنْتَ قَتَلْتَ حَمْزَةَ». قُلْتُ قَدْ كَانَ مِنَ الأَمْرِ مَا بَلَغَكَ. قَالَ: «فَهَلْ تَسْتَطِيعُ أَنْ تُغَيِّبَ وَجْهَكَ عَنِّي». قَالَ فَخَرَجْتُ....(13)

ترجمہ: "....حبشی کہتا ہے جب میں پیغمبر اسلام ﷺ کی خدمت میں پہنچا اور آپ نے مجھے دیکھا تو دریافت فرمایا، کیا تمہارا ہی نام وحشی ہے؟ میں نے عرض کیا کہ جی ہاں۔ آپ نے فرمایا: کیا تم ہی نے حمزہ کو قتل کیا تھا؟ میں نے عرض کیا، جو نبی کریم کو اس

معاملے میں معلوم ہے وہی صحیح ہے۔آپ نے اس پر فرمایا : کیا تم ایسا کر سکتے ہو کہ اپنی صورت مجھے کبھی نہ دکھاؤ؟انہوں نے بیان کیا کہ پھر میں وہاں سے نکل گیا...."

یہ حقیقت ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرت انسانیت کے احترام، اس کے حقوق کی حفاظت اور انسانیت پسندی کا اعلیٰ نمونہ ہے۔آپ ﷺ فرماتے تھے کہ "اگر میں کسی پر ظلم کا مرتکب ہوا ہوں تو وہ بدلہ لے سکتا ہے۔" (14) دنیا کے سارے انصاف پسند اور تاریخ اقوام عالم پر گہری نظر رکھنے والے دانشوران یہ تسلیم کرتے ہیں کہ اسلام امن کا مذہب ہے اسلام دین رحمت و فطرت ہے، اس کے فطری تقاضے ہمیشہ انسانیت کی حفاظت کرتے ہیں۔

اسلام اپنے آغاز سے ہی سراپا رحمت ہے پیغمبر اسلام ﷺ کے اخلاق کے سامنے ظلم و عدوان کی تاریکیاں کافور ہو گئیں۔ تاریخ کے وسیع اور گنجلک صفحات میں ایسے اخلاقی نمونوں اور اس کے بہترین مظاہر کی بھرمار ہے جس میں انسانیت نوازی، رحم دلانہ کیفیت اور نرمی و آشتی کے واضح نقوش ثبت ہیں۔ فتح مکہ کا وہ واقعہ نا قابل فراموش ہے۔ قیدیوں کا ایک ایسا گروہ جس میں مسلمانوں پر تشدد کرنے والے بھی تھے، پھبتیاں کسنے والے بھی، قاتل بھی تھے اور ظالم بھی فتح مکہ کے دن وہ تمام اسیران اپنے متعلق فیصلے کے منتظر تھے لیکن چشم فلک نے دیکھا کہ آپ ﷺ نے فقط انسانیت کے ناطے ان کے وہ تمام جرائم جو نا قابل عفو تھے معاف کر دیئے اور یہ اعلان کر دیا کہ جاؤ تم پر کوئی الزام نہیں، تم آزاد ہو۔

**صنفی امتیاز:** پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرت کا ایک گوشہ جس پر بات چیت اور کلام کی گنجائش ہے وہ صنفی امتیاز ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی زندگی میں خواتین کے حقوق کے حوالے سے بہت سارے اقدامات ایسے کئے جن پر بحث و مباحثہ اور موجودہ دنیا کے لئے نمونہ عمل کے طور پر پیش کیا جانا ضروری ہے۔ اعلانِ رسالت سے قبل خواتین کو کوئی عزت نہیں دی جاتی تھی۔ باپ کی منکوحہ بیٹے کی ملکیت سمجھی جاتی تھی۔ جس طرح مال واسباب کی تجارت ہوتی تھی بعینہٖ خواتین بھی تجارتی جنس کے طور پر بیچی جاتی تھی۔

آپ نے اس عمل کی سختی سے بیخ کنی کی اور اپنی چہیتی بیٹی حضرت فاطمہؑ کو وہ مقام عطا فرمایا کہ آپ سے قبل اس قسم کا تصور بھی محال تھا۔ ایک ایسے ماحول میں جہاں بیٹی کا پیدا ہونا ہی باعثِ ننگ و عار سمجھا جاتا تھا وہی آپ نے اپنی بیٹی کے لئے کھڑے ہو کر استقبال کرنا سکھایا، بیٹی کے ساتھ محبت والفت کی باریکیاں بتلادی اور رحمت قرار دیتے ہوئے انسانیت کے لئے باعث فخر بتایا۔

سیرت کا یہ پہلو آج کی جدید دنیا کے لئے نمونہ عمل اور جدید تفہیم کا طالب ہے۔ گو کہ آج کی متمدن دنیا خواتین کے حقوق کے حوالے سے بڑے بڑے دعوے کرتی نظر آتی ہے، لیکن آج سے چودہ سو سال قبل پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرت میں اس قسم کے نمونے بکثرت ملتے ہیں۔ مگر دنیا نے اُن نمونوں کو صرف واقعاتی نظر سے دیکھا ہے۔ اپنی نجی زندگی میں عمل کرنے کی جستجو نہیں کی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ آج کی دنیا میں بعض خطوں میں خواتین کا احترام اس قدر مضبوط نہیں جس قسم کا ہونا چاہیے۔ خود مسلم معاشروں میں بھی آج کی عورت مظلوم اور بے کس اور ماتحت ہے۔ عورت کو آزادی دینے کی روش آج تک پیدا نہیں کی گئی۔ عورت کو صرف خدمت گزار کے روپ میں دیکھنے کی سعی کی گئی۔ جبکہ اسلامی تعلیمات اور پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرت کے نقطہ نظر سے عورت نظام معاشرت کی بقاء کی سب سے مضبوط فصیل ہے۔

**خون ریزی:** پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرت پر ایک بڑا اتہام خون ریزی ہے۔ اس لفظ کو ایسے عامیانہ انداز میں استعمال کیا جاتا ہے جو خونِ ناحق اور خونِ برحق کی تمیز مٹا ڈالتا ہے۔ اس الزام کے ضمن میں معاہدہ شکنی، دھوکہ دہی اور سفاکی جیسی گھاؤنی تہمتیں بھی لگائی جاتی ہیں۔ یہ درست ہے کہ عہد نبوی میں جنگیں ہوئیں جن میں طرفین کے افراد کام آئے۔ لیکن ان میں سے کوئی جنگ اس لئے نہیں ہوئی کہ اسلام کو خون ریزی مطلوب تھی۔ جنگ بدر تا جنگ احزاب ساری کی ساری جنگیں مدافعانہ تھیں۔ سب کی سب جنگیں یا تو مدینہ کے قریب یا خود مدینہ میں لڑی گئیں۔ مقام جنگ اس بات کا ثبوت ہیں کہ حملہ آور مخالفین اسلام تھے جو اسلام کے مٹانے کے ارادے سے آئے تھے۔

مدافعت کا حق دنیا کا ہر قانون تسلیم کرتا ہے۔ خود عیسائی کتب مقدسہ اس حق سے انکار نہیں کرتیں۔ عہد نامہ قدیم کی رو سے فیصلہ کیا جائے تو پورا مشرک عرب گردن زدنی قرار پائے گا۔ خود عہد نامہ جدید کی رو سے مسلمانوں کو مدافعت کا پورا پورا استحقاق میسر تھا۔ ہم دیکھتے ہیں کہ آخری ایام میں حضرت عیسیٰؑ نے اپنے حواریوں کو مسلح ہونے کی تلقین فرمائی تھی۔ یہ تلقین یقیناً مدافعت کے لئے تھی۔ چنانچہ اندازہ ہوتا ہے کہ شاگردوں نے اس تلقین پر عمل پیرا ہونا شروع کر دیا تھا۔ اناجیل میں تلوار یا مدافعت کا عمومی طور پر کوئی ذکر نہیں لیکن حضرت عیسیٰؑ کی گرفتاری کے موقع پر نہ صرف شاگردوں کے پاس تلوار نظر آتی ہے بلکہ ایک شاگرد حضرت کی مدافعت میں حملہ آور ہوتے بھی نظر آتا ہے:

''اور دیکھو یسوع کے ساتھیوں میں سے ایک نے ہاتھ بڑھا کر اپنی تلوار کھینچی اور سردار کاہن کے نوکر پر چلا کر اس کا کان اڑا دیا اور یسوع نے کہا کہ اپنی تلوار میان میں کرلے کیونکہ یہ تلوار کھینچتے ہیں وہ سب تلوار سے ہلاک کئے جائیں گے۔'' (15)

اس سے یہ تو ثابت ہے کہ یسوع کے شاگرد ہتھیار بند ہونے لگے تھے اور ان میں سے ایک نے مدافعت میں پیش قدمی بھی کی۔ لیکن امن عامہ کے پیش نظر حضرت عیسیٰؑ نے اسے روک دیا کہ گیارہ شاگردوں کی مدافعت قطعی بے اثر ہوتی اور اسے رومی حکومت بغاوت کا رنگ دے کر بے گناہ عوام کا قتل عام کر ڈالتی۔ پیغمبر اسلام ﷺ کی ان مدافعتی جنگوں کے بعد دیگر جنگیں بھی جارحیت نہ تھیں بلکہ وقت کی ضرورت تھیں۔

فتح مکہ قریش کی عہد شکنی کا نتیجہ تھی جو بلا خون ریزی کے حاصل ہوئی اور فتح کے بعد بجائے خون ریزی کے دشمنوں کو امن و سلامتی کا تحفہ عطا ہوا اور ساتھ ہی دنیا کی تاریخ کا ایک انوکھا واقعہ ہوا کہ مفتوح خود فاتح افواج کے ساتھ شامل ہو کر انتہائی جوش و خروش کے ساتھ مشترکہ دشمن کے خلاف جنگ میں حصہ لینے اور اپنی جانیں قربان کرنے لگے۔ جنگ حنین بھی مدافعتی جنگ تھی۔ صحرائی قبائل اور طائف کے باشندوں نے اجتماع کرکے بلا کسی جواز کے مکہ پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ یہ منصوبہ اس قدر اشتعال انگیز تھا کہ مسلمانوں کے لئے تو تھا ہی خود مشرکین مکہ کے لئے بھی ناقابلِ برداشت تھا۔ چنانچہ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ مشرکین مکہ نے بھی رضاکارانہ اس جنگ میں شرکت کی۔

فتح مکہ کے بعد قبائلی وفود کی آمد شروع ہوئی، جنہوں نے اطاعت قبول کرلی۔ اس کے بعد عرب میں اسلام کی عملی مخالفت ختم ہو گئی۔ اس دور میں جتنی مہمات قبائل کی طرف روانہ کی گئیں ان کی نوعیت تادیبی کارروائیوں کی تھی۔ ان مہمات میں شرکاء کی تعداد دس سے لے کر تین سو تک پائی جاتی ہے۔ اس قلیل تعداد کی مہم سے جنگ کا تصور تک نہیں پیدا ہو سکتا۔ اس دور میں صرف ایک جنگی مہم تبوک کی نظر آتی ہے جس کے شرکاء کی تعداد تیس ہزار بیان کی جاتی ہے لیکن یہ مہم بھی جارحانہ نوعیت کی نہ تھی کیونکہ اطلاع ملی تھی کہ سرحد پر روم کی افواج مجتمع ہو رہی ہیں اور جب لشکر تبوک پہنچا تو وہاں دشمن کا کوئی اجتماع نہ پا کر واپس آگیا۔ اگر یہ اقدام مدافعتی نوعیت کا نہ ہوتا تو پر امن طور پر واپسی کے بجائے شام کی طرف پیش قدمی ہونی چاہیے تھی۔

**جنگ اور امن:** پیغمبر اسلام ﷺ کی زندگی میں جنگیں بہت کم اور امن کا چرچا زیادہ رہا۔ آپ نے قریب ۲۶ یا ۲۷ غزاوات میں حصہ لیا اور آپ کی سرپرستی میں ۵۶ سریہ واقع ہوئے۔ ان جنگوں میں اتنے آدمی قتل نہیں ہوئے جس قدر جنگ عظیم اول اور دوم میں قتل ہوئے۔ پیغمبر اسلام ﷺ کی آدھی سے زیادہ زندگی اسلامی تبلیغات اور پر امن جد و جہد پر مبنی ہے۔ مکی زندگی جو ۵۳ سال پر محیط ہے میں آپ کو یا تو اسلام کی تبلیغ کرتے ہوئے دیکھا گیا یا غریب اور نادار افراد کی مدد کرتے ہوئے۔ کبھی مسلح جد و جہد کی کوشش نہیں کی۔

اعلانِ بعثت کے وقت آپ کے ساتھ لوگوں کی تعداد بھی بہت کم تھی۔ آپ کی شریک حیات جو ہمیشہ آپ کے ہم رکاب رہیں وہ بھی اسلامی تعلیمات کی تبلیغات میں آپ کے ہم پلہ رہیں۔ لہٰذا مکی زندگی میں آپ کی روش امن و سلامتی اور اسلام کی تبلیغ کی تھی۔ البتہ مدنی زندگی جو ۱۰ سالہ کے عرصے پر محیط ہے، میں آپ جہاد کے لباس میں ضرور نظر آئے۔

لیکن یہ دور بھی جنگی چپقلش سے زیادہ امن و سلامتی کی طرف راغب ہونے کی ایک کوشش کے طور پر دیکھا گیا۔ آپ اگر جنگ بدر لڑنے نکلتے ہیں تو اپنے ساتھیوں کو برابر پند و نصائح کرتے نظر آتے ہیں کہ خبردار عورتوں، بچوں اور بزرگوں پر ہاتھ مت اُٹھانا، جو زخمی ہے ان کو قتل مت کرنا اور جو جنگ سے فرار اختیار کر رہا ہے اُس کا پیچھا مت کرنا۔

جنگ کے آغاز سے لے کر اختتام تک آپ کی طرف سے مسلسل امنیت اور سلامتی کا اظہار ہو رہا ہے۔ یہاں تک مخالفین میں سے جو لوگ قتل ہوئے تھے اُن کی لاشوں کی بے حرمتی کی بھی سختی سے ممانعت کی اور مسلمانوں کو خبردار کیا کہ زمانہ جاہلیت کی روش اسلامی زندگی میں بالکل بھی روا نہیں ہے۔ اسلام اُن تمام خبیثانہ حرکات کی نفی کرنے آیا ہے جو آج سے قبل عام تھیں۔ جنگ کے اختتام پر مخالفین میں سے جو لوگ قیدی بنائے گئے تھے ان کی رہائی کی دیت تعلیم و تعلم رکھا اور مسلمانوں کو حکم دیا کہ ان مخالفین بھی سے جس کو بھی پڑھنا لکھنا آتا ہے وہ مسلمانوں کو پڑھائے اور اپنی خلاصی کا پروانہ لے کر جائے۔ پیغمبر اسلام ﷺ کی یہ رحمت والی روش شاید آج کی متمدن دنیا میں بھی ممکن نہیں ہے۔

آج کے دور میں پیغمبر اسلام ﷺ کی پیروی کرنے کے دعویدار شدت پسند قیدیوں کو نہ صرف اذیتیں دیتے ہیں بلکہ اُن کے سر قلم کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ پیغمبر اسلام ﷺ کی اس روش کو قابل فہم بنانے کے لئے پھر سے سیرت کی کتابوں کا مطالعہ کرنا ہوگا اور آپ کے اُن تمام واقعات کو درجہ بدرجہ بیان کرنا ہوگا کہ جن سے انسانیت کا اظہار ہوتا ہے، امن و سلامتی کا اظہار ہوتا ہے اور نرم دلی کا اظہار ہوتا ہے۔ بلا شبہ سیرت کے اس پہلو کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت ہے۔ مخالفین کو تنقید کرنے سے پہلے تحقیق کی طرف توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

چند ایک جنگی واقعات کو بنیاد بنا کر پیغمبر اسلام ﷺ کی شخصیت کو قابل نقد و جرح قرار دینا ایک طرفہ روش کا اظہار ہے۔ اسی طرح اسلام کے حامیوں کو بھی اس بات پر غور کرنے کی ضرورت ہے کہ اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی تعلیمات میں جنگ سے زیادہ امن کی طرف توجہ دی گئی ہے اور مسلمانوں کو تشویق دلائی گئی ہے کہ انسانیت کی خدمت اور محافظت اسلام کے اعلیٰ اصولوں اور قوانین میں سے ہے۔ کسی ایک بے گناہ انسان کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہے اور کسی ایک انسان کی جان بخشی پوری انسانیت کی محافظت ہے۔ ایسے اعلیٰ اصولوں اور قوانین کے ہوتے ہوئے اپنی جنگی روش کا اظہار سیرت پیغمبر اسلام ﷺ سے بے زاری کی علامت ہے پیروی کی نہیں۔

**غیر مسلموں سے روابط :** صلح حدیبیہ کے بعد پیغمبر اسلام ﷺ نے شاہانِ عالم کے نام تبلیغی خطوط اپنے سفیروں کے ہاتھ روانہ کئے۔ ایک طرح سے آپ کا یہ اقدام بین الاقوامی تعلقات کی طرف پہلا قدم تھا۔ جن بادشاہوں کو آپ نے خطوط لکھے ان میں نجاشی، مقوقس، ہرقل اور کسریٰ سرفہرست تھے۔ ان خطوط کے جواب میں مختلف بادشاہوں کی طرف سے مختلف ردِ عمل سامنے آیا۔ بعض نے عزت و احترام اور باہمی جذباتیت کا اظہار کیا جبکہ چند ایک نے تعلقات کی طرف قدم بڑھانے کے بجائے اپنی انا پرستی کا اظہار کیا۔ والی مصر مقوقس نے متعدد تحائف سمیت دو معزز قبطی خواتین بھی بھیجیں۔ جن میں سے ایک ام المومنین حضرت ماریہ قبطیہ تھیں۔ بادشاہِ مصر نے ان خواتین کو کنیزوں کے روپ میں بھیجا تھا لیکن پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرت کا کمال یہ ہے کہ ان میں سے ایک مسلمانوں کی ماں (اُم المومنین) بن گئیں یعنی پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی زوجیت میں لے لی جبکہ دوسری صحابیہ رسول بن گئیں۔ اب رہی یہ بات کہ ان خطوط کا متن کیا رہا ہوگا تو واضح رہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کا مشن اسلام کی تبلیغ تھا۔ قرآن کے الفاظ میں مقصد بعثت اور مدعائے نزولِ قرآن یہ تھا:

لِّيُنذِرَ مَن كَانَ حَيًّا وَيَحِقَّ الْقَوْلُ عَلَى الْكَافِرِينَ (16)

ترجمہ: "متنبہ کرو ہر اُس شخص کو جو زندہ ہو اور ثابت ہو بات منکروں پر"

لہٰذا اگر شاہانِ عالم کو تبلیغی خطوط تحریر نہ ہوتے تو تبلیغ کا حق ادا نہ ہوتا اور باہمی تعلقات کی راہ نہیں کھلتی۔ جب مشن ہی تبلیغِ حق تھا تو ان خطوط کی نوعیت تبلیغی کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ دیکھنا یہ ہے کہ آخر بادشاہوں کو دعوتِ حق دینے میں کیا امر مانع ہو سکتا تھا۔ جلالِ شاہی، اجنبیت، فاصلے، معاشرتی تفاوت، انتقامی کاروائی کا خدشہ، یہی تو وہ کیفیات ہو سکتی ہیں جو پیغامِ حق پہنچانے میں رکاوٹ بن سکتی تھیں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مذہبی سربراہ اس قسم کے ہر احساس سے بلند تر ہوتے ہیں۔ رعبِ شاہی انہیں اعلائے کلمۃ الحق سے باز نہیں رکھ سکتا۔

حضرت ابراہیم و نمرود، حضرت موسیٰ اور فرعون، حضرت دانیال اور بخت نصر، سمسون اور شاہ فلسطی، حضرت یحییٰ اور ہیرود، حضرت عیسیٰ اور پیلاطس ان میں سے ہر ایک کے درمیان سارے کے سارے تفاوت موجود تھے لیکن شاہوں کا جلال نبوت کی عظمت کو نہ گہنا سکا۔ ان کی فوجی طاقت اعلائے کلمۃ الحق کو روکنے سے قاصر رہی۔ ان کی انتقامی کارروائیوں کے خوف سے تبلیغ متاثر نہ ہوئی۔ جلالِ خداوندی کے آگے جلالِ شاہی گرد ہوتا ہے۔

معاشرتی تفاوت بے معنی سی شے ہو جاتی ہے کیونکہ حضوری اور معیت جو مقام عطا کرتی ہے اس کے آگے دنیا اور اس کا ہر معاشرتی نظام ہیچ نظر آنے لگتا ہے۔ پیغمبر اسلام ﷺ کی اس روش سے ایک اور بات سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ہمیشہ تعلقات برابری کی بنیادی پر ہونے چاہئیں۔ اعلیٰ اور برتر کی بنیاد پر قائم ہونے والے تعلقات کبھی مساویانہ نہیں ہوتے۔ آپ نے اگرچہ تبلیغ کی غرض سے خطوط لکھے لیکن ان خطوط کے لب و لہجے سے معلوم ہوتا ہے کہ اگرچہ مخاطب کس قدر طاقت ور کیوں نہ ہو تعلقات ایک دوسرے کی خواہشات کے مطابق ہونے چاہئیں۔

**سادہ پرستی:** معاندین نے پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں یہ نظریہ عام کیا کہ ابتداء ہی سے مطمحِ نظر دنیاوی اقتدار تھا اور جب اقتدار میسر آگیا تو ممکنہ دادِ عیش دی۔ یہ دعویٰ اور نظریہ بنیادی طور پر بے حقیقت ہے۔ آپ کا دورِ رسالت شروع ہوا تو عمر چالیس سال سے تجاوز کر چکی تھی۔ عیش پرستی کی عمر تو چالیس سال سے قبل کی ہوتی ہے۔ اس کے بعد تو ایک عام شخص کے کردار میں بھی پختگی آجاتی ہے۔ بد کردار افراد کے کردار میں بھی ٹھہراؤ آجاتا ہے نیک کردار پختہ ہو جاتا ہے اور اس میں کسی کجی کی گنجائش نہیں رہ جاتی۔ تیرہ سالہ مکی دور معاندین کو بھی تاباں نظر آتا ہے۔

اس پورے دور میں ایک جانکاہ جدوجہد کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ہجرت کے بعد کم از کم چھ سال یعنی صلح حدیبیہ تک بادِ مخالف کے تند و تیز طوفان اٹھتے رہے، جنہوں نے سکون درہم برہم کر رکھا تھا۔ ایک طرف معاشرے کی تطہیر و تعمیر، دوسری جانب قلیل وسائل کے ساتھ اس جدید معاشرے کا اندورنی اور بیرونی خطرات سے دفاع ایسے مشاغل تھے جو ایک لمحے کی مہلت نہ دیتے تھے۔ صلح حدیبیہ ہی سیرت طیبہ کا وہ سنگ میل ہے جس کے بعد حالات پوری طرح قابو میں نظر آتے ہیں۔ اس وقت آپ کی عمر انسٹھ سال کی ہو چکی تھی۔ اگر کسی عیش و عشرت کا امکان ہو سکتا ہے تو اس کے بعد کے آخری ایام میں لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ یہ آخری ایام بھی شدید جدوجہد کے ایام ہیں۔

فتح خیبر، فتح مکہ، جنگ حنین، محاصرہ طائف، جعرانہ کی مصروفیات، غزوہِ تبوک، کئی چھوٹی مہمات، وفود عرب، حجۃ الوداع، جیشِ اسامہ کی تیاری، یہ سب آخری سارے برسوں کی مصروفیات ہیں۔ نہ جانے ان ایام میں معاندین کو عیش و عشرت کے کون سے آثار ملے جن کی بنیاد پر انہیں اس دعوے کی جرأت ہوتی ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی سادگی کا تعلق مسلم معاشرے کی تشکیل سے تھا۔ آپ کے لئے ممکن نہ تھا کہ آپ اپنی غریب رعایا کو مفلوک الحال صورت میں دیکھتے ہوئے عیش و عشرت کی زندگی بسر کریں۔ سادگی کو اپنا شعار بناتے ہوئے آپ نے اُس وقت کے حالات کو ان لوگوں کے لئے نمونہ عمل بنایا بلکہ آج کے انسانوں کے لئے بھی یادگار تقلید چھوڑی۔ آج ہم کہہ سکتے ہیں کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی سیرت میں جا بجا ایسے گوشے ہیں جن کی تفصیل، تشریح اور تفہیم کی ضرورت ہے تاکہ آج کی بھٹکتی ہوئی انسانیت کو یک گونہ سکون مل جائے اور زندگی گزارنے کے طور طریقے میسر آسکیں۔

*****

# حوالہ جات


1۔یزدانی، مولانا محمد حنیف، محمد رسول اللہ غیر مسلموں کی نظر میں، مکتبہ نذیرہ،لاہور، ۱۹۹۶ء، ص: ۱۹۵

2۔Gustave E. Von Grunebaum, Medieval Islam A Study in Cultural Orientation, 2nd Edition, The University of Chicago Press, Chicago, 1971, Pg:43

3۔Hendrik Kraemer, the Christian Message in a Non-Christian World, Centre for Contemporary Christianity, 2009, Pg: 138

4۔W. Montgomery Watt, Truth in the Religions, Oneworld Publications, London, 1995, Pg: 28-29

5۔Thomas Karlyle, On Heros, Hero-worship and the Heroic in History, The Pennsylvania State University, USA, Pg: 64-65

6۔Bryan Tuner, Understanding Islam, Pg:19

7۔Max Weber, The Sociology of Religion, Pg:47, Ephxaim Fischoff

8۔Reynold A. Nicholson, The Koran (Qur'an) - with an Introduction, Translator:  E. H. Palmer, 1928, Pg:128

9۔Thomas Carlyle, On Hero Worship, and the Heroic in the Hisrory, Harvard College Library, London, 1840, Pg: 52

10۔Ibid, Pg: 64

11۔Pg:50

12۔Henry Stubb, Rise and Progress of Mahometanism, Kmania University Library, London, 1911, Pg: 143

13۔ابی عبداللہ محمد بن اسماعیل، الجامع الصحیح، کتاب المغازی، باب: قتل حمزہ، رقم الحدیث: ۴۰۷۲، دارُ طوق النجاۃ، بیروت، ۱۴۲۲ھ

14۔ ابی داؤد سلیمان بن الاشعت الازدی، سُنن ابی داؤد، رقم الحدیث: ۲۱۳۴، دارُالرسالۃ العالمیۃ، دمشق، الطبعۃ الاولیٰ، ۱۴۳۰ھ

15۔ متی ۲۶، ۵۱-۵۲

16۔یٰسین، آیت: ۷۰